ALLAMA IQBAL OPEN UNIVERSITY

USMAN NOTES
www.usmannotes.com

Name:

Registration No.:

Course Code: 1920

Program: BS Islamic Studies

Semester: Autumn 2026

علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد

کورس :اسلام اور سائنس • (1920) سطح :بی ایس علومِ اسلامیہ

سمسٹر :خزاں2026

امتحانی مشق نمبر) 2 یونٹ نمبر(9-6

کل نمبر • 100 :کامیابی کے نمبر50 :

حل شدہ اسائنمنٹ گائیڈ

)مطالعہ و حوالہ کے لیے(

نوٹ :یہ گائیڈ صرف مطالعہ اور حوالے کے مقصد کے لیے تیار کی گئی ہے۔ طلبہ کو مشورہ دیا جاتا ہے کہ وہ کورس کی کتاب کے متعلقہ یونٹس غور سے پڑھیں، تصورات کو اچھی طرح سمجھیں اور پھر اسائنمنٹ اپنے الفاظ میں لکھیں۔ ہو بہو نقل کرنے سے گریز کریں، کیونکہ اپنے الفاظ میں لکھی گئی تحریر ہی اصل فہم کی عکاس ہوتی ہے اور امتحان و وائیوا میں بھی کام آتی ہے۔

سوال نمبر :1 قرآن مجید کے ایامِ ستہ کی جدید سائنسی و فلکیاتی نظریات کی روشنی میں تشریح 20) نمبر(

سوال نمبر1 ۔ قرآن مجید میں بیان کردہ" ایام ستہ) "چھ دنوں (کی جدید سائنسی اور فلکیاتی نظریات کی روشنی میں تشریح کریں۔(20)

تعارف

قرآن مجید میں متعدد مقامات پر فرمایا گیا ہے کہ اللہ نے آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں پیدا فرمایا۔ سورۃ اعراف، سورۃ یونس، سورۃ ہود، سورۃ فرقان، سورۃ سجدہ اور سورۃ حدید میں یہ مضمون مختلف اسلوب سے آیا ہے، اور سورۃ فصلت میں تفصیل کچھ یوں بیان ہوئی ہے کہ زمین دو دنوں میں بنائی گئی، اس میں پہاڑ رکھے گئے اور روزیوں کا اندازہ چار دنوں میں مکمل ہوا، اور آسمان جن کا مادہ دھواں تھا دو دنوں میں سات آسمانوں کی صورت میں مکمل ہوئے۔ قدیم مفسرین نے ان دنوں کی نوعیت پر بحث کی ہے کہ یہ ہمارے عام دن ہیں یا خدا کے دن جن کا پیمانہ دوسرا ہے۔ جدید دور میں جب فلکیات و ارضیات نے کائنات و زمین کی طویل عمروں کا تصور پیش کیا تو یہ سوال نئی شکل میں

سامنے آیا کہ ایامِ ستہ کی تشریح ان نظریات کی روشنی میں کیسے کی جائے۔ اس جواب میں پہلے لفظ یوم کے قرآنی استعمال اور کلاسیکی تشریحات کو بیان کیا جائے گا، پھر جدید سائنسی تصورات کا خلاصہ پیش کر کے دونوں کی روشنی میں ایک متوازن تشریح پیش کی جائے گی۔

لفظ یوم کا مفہوم اور کلاسیکی تشریحات

عربی زبان میں یوم کا لفظ صرف چوبیس گھنٹے کے لیے نہیں بلکہ کسی بھی مدت، دور اور مرحلے کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ خود قرآن مجید نے اس وسعت کی تصریح فرمائی ہے۔ ایک مقام پر فرمایا گیا کہ تمہارے رب کے نزدیک ایک دن تمہارے گنے ہوئے ہزار سال کے برابر ہے، اور دوسرے مقام پر فرشتوں کے چڑھنے کے دن کی مقدار پچاس ہزار سال بیان ہوئی ہے۔ سورۃ سجدہ میں یہ بھی فرمایا گیا کہ آسمانی تدبیر زمین کی طرف اس دن میں اترتی ہے جس کی مقدار ہزار سال ہے۔ ان آیات سے واضح ہوتا ہے کہ قرآنی زبان میں دن کا پیمانہ سیاق کے مطابق بدل سکتا ہے، اس لیے ایامِ ستہ کو چوبیس گھنٹے کے چھ دن سمجھنا لازم نہیں۔

کلاسیکی مفسرین کی اکثریت نے بھی اسی اصول کو اپنایا ہے۔ امام طبری نے مختلف اقوال نقل کیے ہیں، امام رازی نے تفصیل سے بحث کی ہے کہ تخلیق کا تدریجی ہونا قدرت کی نشانی ہے کیونکہ اللہ تو کُن کہنے سے فوراً پیدا کر سکتا تھا، لیکن اس نے تدریج اختیار کر کے انسان کو سکھایا کہ عالم اسباب و تدریج سے چلتا ہے۔ بعض مفسرین نے ان چھ دنوں کو اتوار سے جمعے تک کے دنوں سے جوڑا ہے، لیکن ساتھ ہی یہ اعتراف بھی کیا ہے کہ سورج و زمین کی پیدائش سے پہلے دن کی یہ تعریف دقیق مسئلہ ہے، کیونکہ دن کا تصور خود زمین کی گردش سے وابستہ ہے۔ اس بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ کلاسیکی علماء کے ہاں بھی اصل تکیہ اس بات پر ہے کہ تخلیق چھ مرحلوں میں مکمل ہوئی، مرحلوں کی زمانی مقدار علم الٰہی کے پیمانے سے بیان ہوئی ہے۔

جدید فلکیاتی و ارضیاتی نظریات کا خلاصہ

جدید سائنس کے مطابق کائنات کا آغاز تقریباً تیرہ ارب اسی کروڑ سال پہلے ایک عظیم ابتدائی حالت سے ہوا جسے بگ بینگ کہا جاتا ہے؛ ابتدا میں کائنات انتہائی گرم اور گھنی تھی، پھر پھیلاؤ کے ساتھ ٹھنڈی ہوتی گئی، ایٹم بنے، ستارے و کہکشائیں وجود میں آئیں۔ ہمارا نظامِ شمسی تقریباً ساڑھے چار ارب سال پہلے گیس و غبار کے بادل سے بنا؛ یہ نکتہ قابلِ

توجہ ہے کہ سورۃ فصلت میں آسمان کے مادے کو دخان یعنی دھواں نما غبار کہا گیا ہے جو نیبولہ کے تصور سے لفظی سطح پر مشابہت رکھتا ہے، اگرچہ مفسرین اسے حتمی تطابق کے طور پر نہیں بلکہ قابلِ غور اشارے کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ ارضیات کے مطابق زمین کی زندگی کو بڑے بڑے ادوار میں تقسیم کیا جاتا ہے جن میں پرانی چٹانوں کی تشکیل، سمندروں کا قیام، زندگی کا ظہور اور پھر مرحلہ وار تنوع شامل ہے۔ ان نظریات کی بنیاد مشاہدات، فاصلوں کی پیمائش اور چٹانوں کی عمر معلوم کرنے کے طریقوں پر ہے، تاہم ان کی تفصیلات میں ترمیم ہوتی رہتی ہے۔

جدید سائنسی مطالعے میں قریب ترین مرحلہ	تخلیقی مرحلہ) قرآنی بیان(
کائنات کا ابتدائی وحدت سے پھیلاؤ) بگ بینگ(	آسمان و زمین کا یکجا ہونا اور پھر جدا ہونا
زمین کی تشکیل اور ٹھنڈا ہو کر ٹھوس صورت اختیار کرنا	زمین دو دنوں میں
ارضیاتی ادوار، سمندر، فضا اور زندگی کے لیے موزوں حالات	پہاڑ و روزیوں کا تقدیراً اہتمام چار دنوں میں
گیس و غبار سے اجرام و نظاموں کی تشکیل و تنظیم	آسمان دھوئیں سے سات آسمانوں میں دو دنوں میں

مندرجہ بالا جدول کو اسی تناظر میں سمجھنا چاہیے کہ قرآن نے سائنسی درسی کتاب کا اسلوب اختیار نہیں کیا؛ اس نے اجمال میں بڑے مراحل بیان کیے ہیں جن کی تفصیلی میکانیت انسان کے مطالعے پر چھوڑی ہے۔ اس لیے اس جدول کا مقصد حتمی یکسانیت کا دعویٰ نہیں بلکہ یہ دکھانا ہے کہ تدریجی تخلیق کا قرآنی تصور طویل ارضیاتی و فلکیاتی ادوار سے متصادم نہیں ہے۔

ایامِ ستہ کی متوازن جدید تشریح

ان دونوں بنیادوں کو سامنے رکھ کر جدید مفسرین و محققین نے جو تشریح پیش کی ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ایامِ ستہ سے مراد تخلیق کے چھ بڑے ادوار یا مراحل ہیں، چوبیس گھنٹے والے چھ ایام نہیں۔ اس تشریح کی تائید تین دلائل سے ہوتی ہے :اول، خود قرآن کا بیان کہ الٰہی دن ہزار یا پچاس ہزار سال کے برابر ہو سکتا ہے؛ دوم، سورج و زمین کی موجودہ گردش سے پہلے دن کا انسانی پیمانہ قابلِ اطلاق نہیں؛ اور سوم، سورۃ فصلت کی تفصیل جس میں زمین کی پیدائش دو دن، اس کی تکمیل و تقدیرِ ارزاق چار دن اور آسمانوں کی تکمیل دو دن بیان ہوئی ہے، مفسرین کے مطابق چار دن میں زمین کے دو دن شامل ہیں، یوں کل چھ دن بنتے ہیں۔ یہ داخلی حساب کتاب خود مراحل کی زبان کی تائید کرتا ہے، کیونکہ مرحلوں میں تداخل ممکن ہوتا ہے، ترتیب وار گھڑیال والے دنوں میں نہیں۔

اس تشریح میں احتیاط یہ بھی ملحوظ رکھی جاتی ہے کہ سائنسی نظریات متغیر ہیں؛ آج کا غالب نظریہ کل ترمیم پزیر ہو سکتا ہے۔ اس لیے عقیدے کی بنیاد سائنسی نظریات پر نہیں رکھی جاتی؛ قرآن کا مستقل پیغام یہ ہے کہ کائنات ایک قادر و حکیم خالق کی تدریجی، منظم اور مقصدی تخلیق ہے۔ جدید فلکیات جس لمبے زمانی سفر کی بات کرتی ہے وہ اس قرآنی تصور سے ہم آہنگ ہے کہ تخلیق مرحلہ وار ہوئی اور ہر مرحلہ کے لیے خدا کے ہاں ایک مقرر مقدار ہے۔ اسی طرح یہ تشریح مومن کو سائنسی تحقیق سے روکتی نہیں بلکہ یہ کہتی ہے کہ اجرام و ارضیات کا مطالعہ انہی مراحل کی تفصیل جاننے کا نام ہے۔

نتیجہ

خلاصہ یہ ہے کہ ایامِ ستہ سے مراد چھ الٰہی ادوار ہیں جن میں آسمان و زمین کی تخلیق مرحلہ وار مکمل ہوئی؛ لفظ یوم کا قرآنی استعمال، کلاسیکی مفسرین کی بحث اور سورۃ فصلت کی داخلی تفصیل سب اسی کی تائید کرتے ہیں۔ جدید فلکیات و ارضیات کے طویل ادوار کا تصور اس تشریح سے متصادم نہیں بلکہ تدریجی تخلیق کے قرآنی اصول کی سائنسی سطح پر تفصیل فراہم کرتا ہے، بشرطیکہ نہ سائنسی نظریات کو قطعی عقیدہ بنایا جائے اور نہ قرآنی نصوص کو ان سے زبردستی ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی جائے۔ اصل ایمانی حاصل یہ ہے کہ چھ مراحل میں بننے والی یہ منظم کائنات کسی اندھے اتفاق کا نہیں بلکہ ایک حکیم خالق کی تدبیر کا نتیجہ ہے۔

سوال نمبر :2 علمِ جراحت اور علمِ کیمیا کی تعریفیں اور علمِ کیمیا میں مسلمان سائنس دانوں کی خدمات 20) نمبر(

سوال نمبر2 ۔ علم جراحت اور علم کیمیا کی تعریفیں بیان کریں، اور خاص طور پر علم کیمیا کے شعبے میں مسلمان سائنسدانوں کی گراں قدر خدمات کا جائزہ لیں۔(20)

تعارف

مسلمانوں کے سنہری سائنسی دور میں طب و کیمیا وہ دو شعبے ہیں جن میں ان کی خدمات سب سے نمایاں اور سب سے دیرپا ثابت ہوئیں۔ طب کے اندر جراحی یعنی سرجری نے ایک باقاعدہ فن کی صورت اختیار کی، اور کیمیا جادو و دھات

سازی کے اندھیروں سے نکل کر تجرباتی سائنس بنی جس پر جدید کیمیا کی عمارت کھڑی ہے۔ اس جواب میں پہلے علم جراحت اور علم کیمیا کی تعریفیں بیان کی جائیں گی، پھر علم کیمیا کے شعبے میں مسلمان سائنس دانوں کی گراں قدر خدمات کا ایک جامع جائزہ پیش کیا جائے گا، جس میں جابر بن حیان سے لے کر الرازی، ابن سینا اور دیگر محققین کے کارنامے، ان کے ایجاد کردہ طریقے و آلات اور ان کے یورپ پر اثرات شامل ہوں گے۔

علمِ جراحت کی تعریف

جراحت عربی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی زخم کے ہیں، اور علم جراحت سے مراد طب کی وہ شاخ ہے جس میں بیماریوں، چوٹوں، رسولیوں اور جسمانی خرابیوں کا علاج ہاتھ اور آلات کے عمل یعنی آپریشن کے ذریعے کیا جاتا ہے۔ طبی اصطلاح میں جراحت وہ علم و فن ہے جس میں جسم کے کسی حصے کو کھول کر، کاٹ کر، جوڑ کر یا نکال کر خرابی دور کی جاتی ہے، اور اس کے ساتھ زخم کی دیکھ بھال، سلائی، پٹی اور بعد از عمل نگہداشت کا پورا نظم شامل ہوتا ہے۔ جدید تعریف میں جراحت میں تشخیص، عمل سے پہلے کی تیاری، بے ہوشی و بے حسی، جراثیم سے پاک ماحول اور بحالی کا عمل سب شامل ہیں۔ مسلم طبیبوں نے جراحت کو طب سے الگ ایک مستقل فن کے طور پر مدون کیا؛ ابو القاسم الزہراوی نے اپنی کتاب التصریف میں دو سو سے زائد جراحی آلات کی تصویروں سمیت تفصیل دی اور اسے جدید سرجری کا بانی قرار دیا جاتا ہے۔ الزہراوی نے رگوں کو باندھنا، زخموں کو سلنا، ٹوٹی ہڈیوں کو جوڑنا، موتیا بند کا عمل اور پتھری نکالنے کے طریقے بیان کیے جو صدیوں تک یورپ کی جامعات میں پڑھائے جاتے رہے۔

علمِ کیمیا کی تعریف

علم کیمیا سائنس کی وہ شاخ ہے جس میں مادے کی ترکیب، ساخت، خواص اور ان میں ہونے والی تبدیلیوں کا مطالعہ کیا جاتا ہے؛ یعنی کون سا مادہ کن عناصر سے بنا ہے، اسے دوسرے مادوں سے ملانے سے کیا ردعمل ہوتا ہے اور اس عمل میں نئی خصوصیات والے مادے کیسے وجود میں آتے ہیں۔ جدید تعریف کے مطابق کیمیا ایٹموں و سالموں کی سطح پر مادے کے باہمی تعامل کا علم ہے اور اس کی شاخوں میں نامیاتی، غیر نامیاتی، طبیعی اور تحلیلی کیمیا شامل ہیں۔ قدیم دور میں کیمیا کا لفظ دو متضاد معنوں میں استعمال ہوتا تھا :ایک طرف الکیمی یعنی سستے دھاتوں کو سونے میں بدلنے اور اکسیرِ حیات کی تلاش جس میں جادو و وہم شامل تھا، اور دوسری طرف عملی کیمیا جو ادویات، رنگ، شیشہ، صابن

اور دھات کاری کی صنعتوں سے جڑی تھی۔ مسلمان سائنس دانوں کی عظیم خدمت یہ ہے کہ انہوں نے کیمیا کو الکیمی کے وہم سے الگ کر کے تجربہ، پیمائش اور مشاہدے پر مبنی سائنس بنا دیا، اور جدید لفظ کیمسٹری خود عربی الکیمیاء سے ہوتا ہوا یورپی زبانوں میں داخل ہوا، جیسے الکحل، الکلی اور دیگر بہت سی کیمیائی اصطلاحات آج بھی عربی اصل کی گواہی دیتی ہیں۔

علم کیمیا میں مسلمان سائنس دانوں کی خدمات

جابر بن حیان :تجرباتی کیمیا کا بانی

جابر بن حیان کو علم کیمیا کا بانی اور ابو الکیمیاء یعنی کیمیا کا باپ کہا جاتا ہے۔ انہوں نے کیمیا میں تجربے کو اساس قرار دیا اور مشہور قول ہے کہ جو شخص تجربہ نہیں کرتا وہ علم تک کبھی پہنچتا۔ جابر نے تیزابوں کی تیاری و شناخت میں بنیادی کام کیا، نائٹرک ایسڈ، ہائیڈروکلورک ایسڈ اور ان کے آمیزے ایکوا ریجیا کا ذکر ان کی کتب میں ملتا ہے جو سونے کو بھی گلا دیتا تھا۔ انہوں نے کشید یعنی تقطیر، تبلور یعنی کرسٹلائزیشن، تبخیر، تحلیل اور آکسائیڈ بنانے جیسے کیمیائی اعمال کو منظم طریقے سے بیان کیا اور ان کے آلات و برتنوں کی تفصیل دی۔ جابر نے مادوں کی درجہ بندی کی کوشش کی اور یہ اصول دیا کہ ہر دعوے کو ترازو اور مقدار سے پرکھا جائے، جسے بعد کے محققین نے میزان کا تصور کہا۔ ان کی متعدد کتب لاطینی میں ترجمہ ہو کر یورپ میں صدیوں تک مستند سمجھی جاتی رہیں، جہاں وہ Geber کے نام سے مشہور ہوئے۔

الرازی، ابن سینا اور دیگر محققین کے کارنامے

محمد بن زکریا الرازی نے کیمیا کو طبی خدمت سے جوڑا اور اپنی کتاب سر الاسرار میں کیمیائی مادوں، آلات اور اعمال کی انتہائی منظم درجہ بندی پیش کی۔ الرازی نے مادوں کو نباتی، حیوانی اور معدنی اقسام میں بانٹا، سلفیورک ایسڈ اور الکحل کی کشید کی تفصیلات دیں اور سب سے اہم بات یہ کہ کیمیا میں سونے بنانے کے لالچ کے بجائے دواسازی اور عملی فوائد کو مقصد بنایا۔ ابن سینا نے کیمیا و طب کے باہمی ربط کو واضح کیا، ان کی القانون فی الطب میں معدنی ادویات اور ان کی تیاری کا باب ہے، البتہ وہ دھاتوں کی مصنوعی تبدیلی کے دعووں کے ناقد بھی تھے جس سے ان کی تنقیدی سائنسی سوچ ظاہر ہوتی ہے۔ الکندی نے عطر سازی کی کیمیا پر کتاب لکھی، البیرونی نے دھاتوں و جواہرات کی

مخصوص کشش یعنی specific gravity کی درست پیمائشیں کیں جو ان کی تجرباتی مہارت کا ثبوت ہیں، اور مجریطی و طغرائی جیسے محققین نے اندلس و مشرق میں کیمیائی روایت کو آگے بڑھایا۔ اس دور میں مسلمان کیمیا دانوں نے صابن سازی، شیشہ سازی، رنگ و روغن، چمڑا رنگنے اور بارود جیسی صنعتوں کو بھی کیمیائی اصولوں پر استوار کیا، جس سے کیمیا لیبارٹری سے نکل کر صنعت و معاشرت کا انجن بن گئی۔

طریقہ کار کی اصلاح اور یورپ پر اثرات

مسلمانوں کی سب سے بڑی خدمت مواد کی دریافتوں سے بڑھ کر طریقہ کار کی اصلاح ہے۔ انہوں نے تجربے کی تحریری ریکارڈ سازی، مقدار و پیمائش کی پابندی، آلات کی بہتری اور نتائج کی تصدیق کے اصول رائج کیے جو جدید لیبارٹری کی بنیاد ہیں۔ ان کے تراجم جب بارہویں صدی کے بعد لاطینی میں منتقل ہوئے تو یورپ کو پہلی بار ایک منظم کیمیا ملا؛ یورپی الکیمی دانوں نے یہی طریقے اپنائے اور بالآخر سترہویں و اٹھارویں صدی میں انہی بنیادوں پر جدید کیمیا کھڑی ہوئی۔ کیمیا کی اصطلاحات، تیزابوں کے نام، کشید کے آلات اور دواسازی کے نسخے اس ورثے کی زندہ شہادت ہیں۔ منصف مزاج مغربی مورخین بھی اعتراف کرتے ہیں کہ مسلمانوں کے بغیر کیمیا کی تاریخ ناقص ہے، کیونکہ تجرباتی کیمیا کی پیدائش دراصل انہی کی لیبارٹریوں میں ہوئی تھی۔

نتیجہ

خلاصہ یہ ہے کہ علم جراحت طب کی وہ شاخ ہے جس میں بیماریوں کا علاج عمل و آلات سے کیا جاتا ہے اور مسلمان طبیب خصوصاً الزہراوی اس کے مدون و سرخیل ہیں، جبکہ علم کیمیا مادے کی ترکیب و تبدیلی کا علم ہے جسے مسلمان سائنس دانوں نے الکیمی کے وہم سے نکال کر تجرباتی سائنس بنا دیا۔ جابر بن حیان کے تیزابوں و اعمال، الرازی کی درجہ بندی و دواسازی، البیرونی کی پیمائشوں اور دیگر محققین کی صنعتی خدمات نے جدید کیمیا کی بنیاد رکھی اور لاطینی تراجم کے ذریعے یورپ کی علمی نشاۃ ثانیہ کو فیض پہنچایا۔ یہ خدمات اس بات کا ثبوت ہیں کہ اسلامی محرکات کے تحت سائنس کس طرح انسانیت کی دیرپا خدمت میں ڈھل سکتی ہے۔

سوال نمبر :3 امتِ مسلمہ کے علمی و فکری زوال کے اسباب اور سدباب کے اقدامات

20)نمبر(

سوال نمبر3 ۔ امت مسلمہ کے علمی و فکری زوال کے بنیادی اسباب کی نشاندہی کریں، نیز اس زوال کے سدباب کے لیے ممکنہ اقدامات پر روشنی ڈالیں۔(20)

تعارف

تاریخ کا ایک حیران کن سوال یہ ہے کہ وہ امت جو آٹھویں سے تیرہویں صدی تک علم و سائنس میں پوری دنیا کی استاد تھی، بعد کی صدیوں میں اس قدر پیچھے کیوں رہ گئی کہ مغرب کی شاگرد بن گئی۔ یہ زوال یکدم نہیں آیا بلکہ کئی صدیوں میں اندرونی کمزوریوں اور بیرونی صدموں کے امتزاج سے پروان چڑھا۔ اس کے اسباب سمجھے بغیر احیاء کی کوئی کوشش کامیاب نہیں ہو سکتی، کیونکہ علاج ہمیشہ درست تشخیص سے شروع ہوتا ہے۔ اس جواب میں پہلے علمی و فکری زوال کے بنیادی اسباب کی نشاندہی کی جائے گی، جن میں فکری جمود، تقلید، تعلیمی نظام کی خرابی، سیاسی انتشار اور بیرونی حملے شامل ہیں، اور پھر اس زوال کے سدباب کے لیے ممکنہ عملی اقدامات تجویز کیے جائیں گے۔

علمی و فکری زوال کے بنیادی اسباب

فکری جمود، تقلید اور اجتہاد سے دوری

پہلا اور سب سے گہرا سبب فکری جمود ہے۔ ابتدائی صدیوں میں مسلم فکر کی خصوصیت سوال، تحقیق اور اجتہاد تھی، لیکن بعد میں آہستہ آہستہ تقلید غالب آ گئی :پچھلی کتابوں کی شرح و حاشیہ ہی علم سمجھ لیا گیا، نئے سوال پوچھنا گستاخی قرار پایا اور تحقیق کا جذبہ ماند پڑ گیا۔ جب اجتہاد کا دروازہ عملی طور پر بند سمجھا جانے لگا تو بدلتے حالات کے مسائل کا حل فکری قیادت سے باہر نکل گیا۔ اسی جمود نے سائنسی علوم کو بھی متاثر کیا؛ فلسفہ و سائنس پر مشکوک نگاہ، قدرتی علوم کو دینی علوم سے الگ اور کم تر سمجھنا، اور مشاہدے و تجربے کے بجائے قدیم نصوص کی اندھی پیروی وہ عوامل ہیں جنہوں نے تخلیقی اذہان کی نشوونما روک دی۔ یہ نکتہ بھی اہم ہے کہ تجرباتی علوم کی سرپرستی کم ہوئی اور اصل زور زبانی و نقلی مباحث پر رہ گیا۔

تعلیمی نظام کی خرابی اور سیاسی و خارجی اسباب

دوسرا سبب تعلیمی نظام کا بتدریج زوال ہے۔ سنہری دور میں مسجد، مدرسہ، کتب خانہ، رصد گاہ اور ہسپتال سب علم کے باہم جڑے مراکز تھے اور وقف کی آمدنی انہیں چلاتی تھی، مگر بعد میں نصاب محدود ہوتا گیا، سائنسی و عقلی علوم کا حصہ گھٹتا گیا، اساتذہ کی تنخواہ و حیثیت متاثر ہوئی اور تعلیم کا مقصد ڈگری و منصب رہ گیا جستجو نہ رہی۔ تیسرا سبب سیاسی انتشار و انحطاط ہے: خلافت کا بکھراؤ، باہمی جنگیں، ظالم و نااہل حکمرانوں کی علم دشمنی اور وسائل کی تباہی نے مراکزِ علم کو اجاڑ دیا۔ چوتھا سبب بیرونی صدمے ہیں؛ صلیبی جنگوں نے شام کے علمی مراکز کو نقصان پہنچایا اور تیرہویں صدی میں منگول حملے نے بغداد کی لائبریریوں و علماء کو تباہ کر دیا جس سے علمی تسلسل ٹوٹ گیا۔ اس کے بعد سولہویں صدی سے یورپی استعمار نے مسلم دنیا کے وسائل لوٹے، مقامی صنعت و تعلیم کو پسماندہ رکھا اور ذہنی غلامی کا ایسا نظام بنایا جس کے اثرات آج تک باقی ہیں۔ پانچواں سبب اقتصادی کمزوری اور تجارت کا سمندری راستوں کی طرف منتقل ہونا ہے جس سے مسلم شہر و مراکز محروم ہوتے گئے اور علم کی سرپرستی کا مالی ذریعہ سوکھتا گیا۔

زوال کے سدباب کے لیے ممکنہ اقدامات

زوال کا سدباب سب سے پہلے اسی فکری اصلاح سے شروع ہوتا ہے جہاں سے زوال شروع ہوا تھا۔ قرآن کی اصل تعلیمات کی طرف رجوع کر کے علم، عقل اور تدبر کو دینی قدر کے طور پر زندہ کیا جائے، تقلید کے بجائے تحقیق و اجتہاد کی حوصلہ افزائی ہو اور علما و سائنس دان کے درمیان فاصلہ ختم کر کے دونوں طبقوں کو ایک دوسرے کا معاون بنایا جائے۔ دوسرا قدم تعلیمی انقلاب ہے: نصاب میں دینی علوم کے ساتھ سائنسی و تکنیکی علوم کو بھرپور جگہ دی جائے، رٹے کے بجائے سوال و تجربے پر مبنی تدریس ہو، اساتذہ کی تربیت و معاشی حیثیت بہتر بنائی جائے، اور جامعات کو تحقیقی مراکز میں بدلا جائے جن میں لیبارٹری، فنڈ اور علمی آزادی موجود ہو۔ تیسرا قدم ادارہ جاتی اصلاح ہے: تحقیقی اداروں، رصد گاہوں، اشاعتی مراکز اور سائنسی تراجم کے نظام کو جدید خطوط پر قائم کیا جائے اور اہلِ علم کی سرپرستی کو ریاست و سماج کی ترجیح بنایا جائے، جس کے لیے وقف کے نظام کی جدید صورت بھی معاون ہو سکتی ہے۔

اس سلسلے میں ایک اور پہلو نوجوان نسل کی سمت کا تعین ہے۔ جب تک امت کے بہترین ذہن علم و تحقیق کو عزت و روزگار کا راستہ نہیں سمجھیں گے اور ان کے سامنے بیرونی دنیا کی چمک دمک ہی واحد نمونہ رہے گی، دماغی اخراج یعنی برین ڈرین جاری رہے گا۔ اس کے سدباب کے لیے علمی شخصیات کو سماجی عزت دینا، تحقیق کو میڈیا و نصاب میں نمایاں کرنا اور کامیاب مقامی سائنس دانوں و موجدوں کو نوجوانوں کے سامنے بطور رول ماڈل پیش کرنا ضروری ہے۔ ساتھ ہی دینی تعلیم کے اداروں اور جدید معاشرے کے درمیان تبادلہ پروگرام اور مشترکہ تحقیقی منصوبے اس خلیج کو پاٹ سکتے ہیں جو زوال کے اسباب میں سے ایک بڑا سبب رہی ہے، تاکہ دین و دنیا کی یہ مصنوعی تقسیم ختم ہو اور یکجا علمی شخصیت پروان چڑھے۔

چوتھا قدم اقتصادی و تکنیکی خود انحصاری ہے :سائنس و ٹیکنالوجی میں سرمایہ کاری، مقامی صنعت کا فروغ، بیرون ملک مقیم اہلِ ذہانت کی واپسی کی ترغیب اور تحقیقی نتائج کو صنعت سے جوڑنا اس لیے ضروری ہے کہ علم روزگار و پیداوار سے جڑے بغیر زندہ نہیں رہتا۔ پانچواں قدم زبان و ابلاغ کی اصلاح ہے :سائنسی علوم کو مادری زبان میں منتقل کرنا، کتاب و میڈیا کے ذریعے سائنسی شعور عام کرنا اور عوام میں توہم پرستی کے خاتمے کی مہم چلانا معاشرے کا مجموعی مزاج بدلے گا۔ آخری اور اہم بات اتحاد و استحکام ہے :مسلم ممالک کے درمیان علمی تعاون، وسائل کی شراکت اور سیاسی استحکام کے بغیر کوئی قوم سائنسی مسابقت میں ٹھہر نہیں سکتی۔ ان اقدامات میں سے ہر ایک طویل المیعاد محنت مانگتا ہے، مگر یہی وہ واحد راستہ ہے جو زوال کو احیاء میں بدل سکتا ہے۔

نتیجہ

خلاصہ یہ ہے کہ امت مسلمہ کا علمی و فکری زوال فکری جمود و تقلید، تعلیمی نظام کی خرابی، سیاسی انتشار و نااہلی، منگول و صلیبی صدموں اور استعماری لوٹ کھسوٹ کے مجموعی اثر کا نتیجہ تھا، کسی ایک سبب کی پیداوار نہیں۔ اسی لیے اس کا سدباب بھی ہمہ جہت کوشش مانگتا ہے :قرآنی فکر کی طرف رجوع، اجتہاد و تحقیق کا احیا، تعلیمی و ادارہ جاتی انقلاب، اقتصادی خود انحصاری، زبان و ابلاغ کی اصلاح اور امت کا اتحاد۔ تاریخ کا سبق روشن ہے کہ یہ امت جب اپنے اصل محرکات یعنی علم و عمل کی طرف لوٹی ہے تو قیادت اس کا مقدر بنی ہے؛ آج بھی نشاۃ ثانیہ کا دروازہ اسی چابی سے کھلے گا۔

سوال نمبر :4 علمِ فلکیات کی تعریف اور مسلمان سائنس دانوں کے نمایاں کارنامے (20 نمبر)

سوال نمبر4 ۔ علم فلکیات (Astronomy) کی تعریف کریں اور اس شعبے میں مسلمان سائنسدانوں کے نمایاں کارناموں کو تفصیل سے بیان کریں۔(20)

تعارف

علم فلکیات انسان کے قدیم ترین علوم میں سے ہے اور مسلمانوں کے سنہری دور میں اس علم نے غیر معمولی ترقی کی۔ نماز کے اوقات، قبلے کی سمت، قمری تقویم اور بحری و بری سفر کی ضروریات نے مسلمانوں کو آسمان کی طرف متوجہ کیا، اور پھر ان کے سائنس دانوں نے مشاہدے، ریاضی اور آلات سازی میں وہ کارنامے انجام دیے کہ آج بھی آسمان کے دو سو سے زائد ستاروں کے نام عربی زبان سے آئے ہوئے ہیں اور کرہ ارض پر موجود چاند کے کئی خطوں کے نام مسلم فلکیات دانوں کے ناموں پر ہیں۔ اس جواب میں پہلے علم فلکیات کی تعریف اور اس کی شاخیں بیان کی جائیں گی، پھر مسلمان سائنس دانوں کے نمایاں کارنامے ترتیب وار اور تفصیل سے بیان کیے جائیں گے، جن میں ان کے نظام، رصد گاہیں، زیجات اور آلات شامل ہوں گے۔

علمِ فلکیات کی تعریف اور شاخیں

علم فلکیات سے مراد وہ سائنس ہے جس میں اجرامِ سماوی یعنی سورج، چاند، ستاروں، سیاروں، کہکشاؤں اور دم دار ستاروں کی ساخت، حرکت، فاصلے، جسامت اور ان کے باہمی تعلقات کا مشاہدے و ریاضی کی مدد سے مطالعہ کیا جاتا ہے۔ اردو میں اسے علمِ ہیئت اور علمِ نجوم بھی کہا جاتا ہے، لیکن یہ تصریح ضروری ہے کہ فلکیات سائنس ہے جبکہ نجوم کی وہ صورت جس میں ستاروں سے قسمت کا حال بتایا جاتا ہے یعنی علمِ نجومِ تنجیمی کو سائنس نہیں سمجھا جاتا اور اسلامی تعلیمات بھی اس کی ممانعت کرتی ہیں۔ فلکیات کی اہم شاخوں میں مشاہداتی فلکیات، نظری فلکیات اور فلکی طبیعیات شامل ہیں؛ مشاہداتی فلکیات میں دوربین و آلات سے اجرام دیکھے و ناپے جاتے ہیں، نظری فلکیات میں ریاضی سے ان کی حرکات کے قوانین و جداول بنائے جاتے ہیں، اور فلکی طبیعیات میں اجرام کی داخلی ساخت و توانائی کا

مطالعہ ہوتا ہے۔ مسلمانوں نے خاص طور پر پہلی دو شاخوں میں بنیادی کام کیا اور زیج یعنی فلکیاتی جداول کی اس صنف کو عروج تک پہنچایا جس سے کیلنڈر، اوقات اور سمتوں کا تعین ہوتا تھا۔

مسلمان سائنس دانوں کے نمایاں کارنامے

ترجمہ، تنقید اور بطلیموسی نظام کی اصلاح

مسلمان فلکیات دانوں کا پہلا کارنامہ یہ تھا کہ انہوں نے بطلیموس کی المجسط کا ترجمہ کیا مگر اسے مسلمہ مان کر قبول نہیں کیا بلکہ مشاہدات سے اس کی غلطیاں درست کیں۔ الفرغانی نے زمین کے قطر و محیط کی پیمائش میں حصہ لیا اور ان کی کتاب یورپ میں صدیوں تک درسی رہی۔ البتانی کو قرونِ وسطیٰ کا سب سے بڑا مشاہداتی فلکیات دان کہا جاتا ہے؛ انہوں نے سورج و چاند کی حرکات کے جداول درست کیے، سال کی لمبائی کی انتہائی درست پیمائش کی اور مثلثات یعنی ٹرگنومیٹری کو فلکیات کا باقاعدہ آلہ بنایا، جس کی کتاب کا لاطینی اثر یورپ پر گہرا پڑا۔ صوفی نے ستاروں کی مستقل فہرست تیار کی اور بہت سے ستاروں کے عربی نام دیے جو آج بھی عالمی فلکیات میں استعمال ہوتے ہیں۔ ابن یونس نے قاہرہ میں دقیق مشاہدات کیے اور چاند و سورج گرہن کے ریکارڈ بنائے جو آج بھی تاریخی فلکیات میں مستعمل ہیں۔

رصد گاہیں، زیجات اور عظیم محققین

دوسرا بڑا کارنامہ رصد گاہوں کا قیام ہے۔ بغداد، دمشق، مراغہ، سمرقند اور استنبول کی رصد گاہیں اپنے دور کے عظیم تحقیقی ادارے تھے۔ مراغہ کی رصد گاہ میں نصیر الدین طوسی نے زیجِ ایلخانی تیار کیا اور سیاروں کی حرکت کی وضاحت کے لیے نئے ریاضیاتی نمونے پیش کیے جن میں طوسی جوڑے کا تصور خاص اہمیت رکھتا ہے؛ ماہرین بتاتے ہیں کہ بعد میں کوپرنیکس کے کام میں اسی نوع کے نمونے ملتے ہیں۔ ابن شاطر نے دمشق میں بطلیموسی نظام کی خامیوں کو دور کر کے نئے نمونے دیے جن کو بعض محققین کوپرنیکس کے نظام کے پیش رو قرار دیتے ہیں۔ سمرقند میں الغ بیگ نے عظیم رصد گاہ بنا کر ستاروں کی وہ فہرست تیار کی جو دوربین سے پہلے کی دقیق ترین فہرستوں میں شمار ہوتی ہے اور اوقاتِ نماز کے لیے عظیم دیواری آلہ تعمیر کیا۔ اس کے علاوہ البیرونی نے زمین کے محیط کی حیران کن حد تک درست پیمائش کی اور قمری و شمسی حرکات پر تنقیدی تحریریں لکھیں، الزرقالی نے اسطرلاب کی بہتر صورت صفیحہ ایجاد کی اور ان کے جداول اندلس سے یورپ تک رائج رہے۔

آلات، تقویم اور عملی خدمات

تیسرا کارنامہ آلات سازی اور عملی فلکیات ہے۔ مسلمانوں نے اسطرلاب کو کمال تک پہنچایا جس سے وقت، سمت، عرض بلد اور ستاروں کی بلندی معلوم ہوتی تھی؛ چوتھائی دائرے، کرہ سماوی اور مشاہداتی حلقے ان کے عام آلات تھے۔ قبلے کی درست سمت کے تعین نے کروی مثلثات کو ترقی دی، اوقاتِ نماز کے حساب نے شمسی حرکات کے دقیق جداول پیدا کیے اور عمر خیام کی سربراہی میں تیار کردہ جلالی تقویم اپنی درستگی میں آج کے رائج تقویم سے بھی بعض محققین کے نزدیک بہتر سمجھی جاتی ہے۔ انہی خدمات کی وجہ سے دنیا بھر کی مساجد و جامعات میں مزولہ یعنی دھوپ گھڑیاں اور میناروں سے وقت کے اعلان کا نظام قائم ہوا۔ یورپ نے اندلس و سسلی کے راستے یہ ورثہ حاصل کیا اور نشاۃ ثانیہ کے فلکیات دانوں نے انہی بنیادوں پر نئی عمارت تعمیر کی۔

نمایاں کارنامہ	سائنس دان
سورج و چاند کے درست جداول، سال کی لمبائی کی پیمائش، مثلثات کا استعمال	البتانی
ثابت ستاروں کی فہرست اور ستاروں کے عربی نام	عبد الرحمن الصوفی
مراغہ رصد گاہ، زیج ایلخانی، سیاروی حرکت کے نئے نمونے	نصیر الدین طوسی
سمرقند رصد گاہ اور ستاروں کی دقیق فہرست	الغ بیگ
زمین کے محیط کی پیمائش اور تقابلی فلکیاتی تحقیق	البیرونی
بہتر اسطرلاب) صفیحہ (اور رائج الوقت زیج	الزرقالی

نتیجہ

خلاصہ یہ ہے کہ علم فلکیات اجرامِ سماوی کی ساخت و حرکت کا منظم مطالعہ ہے، اور مسلمان سائنس دانوں نے اس میں ترجمے سے آگے بڑھ کر مشاہدہ، تنقید، ریاضیاتی نمونے، رصد گاہیں، زیجات اور آلات کی صورت میں ایسے کارنامے چھوڑے ہیں جن کے بغیر جدید فلکیات کی تاریخ مکمل نہیں ہوتی۔ ستاروں کے عربی نام، طوسی و ابن شاطر کے نمونوں کی بازگشت اور الغ بیگ کی فہرستیں اس ورثے کی زندہ علامتیں ہیں۔ یہ باب اس حقیقت کا بھی ثبوت ہے کہ مذہبی ضروریات جب علمی تحقیق سے جڑ جائیں تو سائنس کے لیے کتنی بڑی محرک بن سکتی ہیں۔

سوال نمبر :5 وقوعِ قیامت پر سائنسی نقطہ نظر اور ممکنہ فلکیاتی و ارضیاتی شواہد

20)نمبر(

سوال نمبر5 ۔ وقوعِ قیامت پر سائنسی نقطہ نظر سے بحث کریں اور اس کے ممکنہ فلکیاتی اور ارضیاتی شواہد پر ایک نوٹ لکھیں۔(20)

تعارف

قیامت کا وقوع اسلامی عقائد کی بنیادی اساس ہے :قرآن مجید جا بجا اس دن کی ہولناکیوں کا ذکر کرتا ہے کہ سورج لپیٹ دیا جائے گا، ستارے جھڑ جائیں گے، سمندر بھڑکا دیے جائیں گے، پہاڑ چلنے لگیں گے اور زمین اپنے بوجھ نکال پھینکے گی۔ جدید دور میں یہ سوال اٹھایا جاتا ہے کہ سائنس کائنات و زمین کے انجام کے بارے میں کیا کہتی ہے اور کیا سائنسی شواہد ان قرآنی بیانات سے کوئی نسبت رکھتے ہیں۔ اس نوٹ میں پہلے اس اصول کو واضح کیا جائے گا کہ سائنس کا دائرہ کیا ہے اور قیامت جیسے غیبی واقعے پر اس کی بحث کی نوعیت کیا ہو سکتی ہے، پھر کائنات کے انجام کے بارے میں جدید فلکیاتی نظریات اور زمین کی ممکنہ تباہیوں کے ارضیاتی شواہد کا جائزہ لے کر ایک متوازن نتیجہ پیش کیا جائے گا۔

سائنسی نقطہ نظر کی نوعیت اور حدود

سب سے پہلے یہ اصول ذہن نشین رہے کہ سائنس کا طریقہ مشاہدہ و تجربہ ہے، اس لیے وہ ان مظاہر پر بحث کر سکتی ہے جو اس کے قوانین کے تحت بار بار وقوع پذیر ہوں یا جن کے آثار ناپے جا سکیں۔ قیامت بطور ایک یکتا، حتمی اور غیبی واقعے کے اپنے وقت و کیفیت میں وحی کا موضوع ہے، اس لیے سائنس نہ اس کی تاریخ بتا سکتی ہے نہ اس کا انکار یا اثبات تجربے سے کر سکتی ہے۔ البتہ سائنس یہ بتا سکتی ہے کہ یہ کائنات ابدی نہیں؛ اس کا آغاز ہوا ہے، اس کے قوانین اسے تبدیلی کی طرف لے جا رہے ہیں، اور زمین سمیت ہر نظام ایک دن ناقابلِ سکونت یا ختم ہو جانے کی طرف مائل ہے۔ یہ عمومی نتیجہ اس قرآنی اصول سے مطابقت رکھتا ہے کہ ہر چیز فانی ہے اور باقی صرف اللہ کی ذات ہے۔ اس لیے سائنسی بحث کا درست مقام یہ ہے کہ کائنات کے ممکنہ انجام کے مناظر دیکھے جائیں، نہ کہ انہیں قیامت کی حتمی تصویر قرار دیا جائے۔

کائنات کے انجام کے فلکیاتی نظریات

جدید فلکیات کے مطابق سورج اپنی زندگی کے درمیانی مرحلے میں ہے؛ تقریباً پانچ ارب سال بعد اس کا ایندھن ختم ہونے لگے گا، وہ پھیل کر سرخ دیو بن جائے گا اور زمین اس کی تپش سے جھلس جائے گی یا اس میں سما جائے گی، آخر کار سورج بجھ کر سفید بونا رہ جائے گا۔ قرآن میں سورج کے لپیٹے جانے اور ستاروں کے جھڑنے کا ذکر اس بڑے فلکیاتی انجام کے عمومی تصور سے مناسبت رکھتا سمجھا جاتا ہے۔ کائنات کے مجموعی انجام پر بھی کئی نظریات ہیں :ایک یہ کہ پھیلاؤ جاری رہے گا اور توانائی بکھر کر کائنات حرارتی موت کا شکار ہو جائے گی جہاں کوئی کارآمد توانائی باقی نہیں رہے گی؛ دوسرا امکان یہ ہے کہ پھیلاؤ کی نوعیت بدلنے سے کائنات الٹی سمت سمٹے؛ اور تاریک توانائی کی بحث نے پھیلاؤ کے تیز تر ہونے اور نظاموں کے بکھرنے کے امکانات بھی پیش کیے ہیں۔ اس کے علاوہ شہابیوں و دم دار ستاروں کا زمین سے ٹکراؤ فلکیات کا تسلیم شدہ خطرہ ہے جس کی تاریخی مثال ساڑھے چھ کروڑ سال پہلے ڈائنوسارز کی تباہی مانی جاتی ہے۔ یہ تمام مناظر اس بات کی سائنسی گواہی ہیں کہ موجودہ کائناتی نظام دائمی سکون کی حالت میں نہیں بلکہ ایک انجام کی طرف بڑھ رہا ہے۔

زمین کی تباہی کے ارضیاتی شواہد

ارضیاتی نقطہ نظر سے زمین بھی ہمیشہ ایک جیسی نہیں رہی۔ اس کی تاریخ میں عظیم آتش فشانوں کے پھٹنے، برفانی ادوار، سمندروں کی سطح کے بڑے اتار چڑھاؤ اور براعظموں کی حرکت جیسے واقعات کے شواہد چٹانوں میں محفوظ ہیں۔ آج کے سائنس دان زلزلوں، سونامی، سپر آتش فشاں اور ماحولیاتی نظام کے بگاڑ کو بھی انسانی بقا کے لیے سنگین خطرات میں شمار کرتے ہیں۔ قرآن میں قیامت کے بیان میں زمین کے زلزلے، پہاڑوں کے ریزہ ریزہ ہونے، سمندروں کے بھڑکنے اور زمین کے اپنے اندر کے بوجھ نکالنے کا ذکر ہے؛ ارضیات زمین کے اندرونی دباؤ اور پلیٹوں کی حرکات کی جو تصویر پیش کرتی ہے وہ اس قسم کے مناظر کے طبعی امکان کو اجنبی نہیں رہنے دیتی۔ تاہم یہ واضح رہے کہ یہ واقعات جب بھی طبعی پیمانے پر ہوں گے وہ قیامت کے اس ہولناک مجموعی منظر کا معمولی سا اندازہ ہی دے سکتے ہیں جس کا مکمل احاطہ انسانی تصور سے باہر ہے۔ الغرض ارضیاتی شواہد زمین کے نظام کے عدم استحکام اور تبدیلی کی طرف اشارہ کرتے ہیں جو اس عقیدے سے ہم آہنگ ہے کہ یہ دنیا فانی ہے۔

متوازن سائنسی و ایمانی نتیجہ

اس بحث کا متوازن نتیجہ یہ ہے کہ سائنس قیامت کے وقت و کیفیت کا تعین نہیں کر سکتی کیونکہ یہ وحی کے دائرے کا مسئلہ ہے، لیکن سائنس کا مجموعی بیان، کہ کائنات کا آغاز ہے، اس کے نظام بدلتے ہیں، سورج سمیت ستارے انجام کو پہنچیں گے اور زمین کا نظام کسی طرح سے ٹوٹ سکتا ہے، اس بنیادی قرآنی پیغام سے متصادم نہیں کہ یہ دنیا فانی ہے اور ایک دن یہ پورا نظام لپیٹ دیا جائے گا۔ عقلمندی کا تقاضا یہ ہے کہ نہ تو ہر نئے سائنسی نظریے کو قیامت کی قطعی تشریح قرار دیا جائے اور نہ سائنس کو اس بنیاد پر رد کیا جائے؛ بلکہ سائنسی مطالعہ انسان کو اس فنا کا احساس دلا کر اسی غور و فکر کی طرف لے جائے جس کی قرآن دعوت دیتا ہے۔ اصل سبق سائنسی تفصیل سے بڑھ کر ایمانی ہے کہ انجام یقینی ہے اس لیے زندگی کی تیاری اسی انجام کے حساب سے ہونی چاہیے۔

نتیجہ

خلاصہ یہ ہے کہ سائنسی نقطہ نظر سے کائنات و زمین کا موجودہ نظام دائمی نہیں۔ فلکیات سورج کے انجام، ستاروں کی موت، کائنات کے پھیلاؤ کے ممکنہ آخری مناظر اور شہابی خطرات کی بات کرتی ہے، اور ارضیات زمین کے ماضی کے عظیم انقلابات اور اس کے اندرونی عدم استحکام کے شواہد پیش کرتی ہے۔ یہ شواہد قیامت کی تفصیلی تصویر تو نہیں دیتے، کیونکہ وہ غیب کا موضوع ہے، مگر دنیا کی فنا اور نظامِ کائنات کے خاتمے کے عمومی اصول کی تائید ضرور کرتے ہیں جسے قرآن بیان کرتا ہے۔ لہٰذا سائنس کے مطالعے کو قیامت کے عقیدے کے خلاف سمجھنے کے بجائے اسے اسی حقیقت کی طرف توجہ دلانے والا معاون سمجھنا زیادہ درست اور متوازن رویہ ہے۔